گمشدہ آدمیت کی متلاشی نظمیں

ڈاکٹرسعادت سعید[1]

Abstract:

"Prose poetry has discovered its formative principles through out the world. This genre has gained popularity in the Urdu literary atmosphere of the subcontinent. In Pakistan so many prominent poets wrote prose poetry. Several critics positively appreciated this genre because of its vast possibilities in the realm of poetic expressions. The writer of this article wrote about the meaning patterns in the poems of Dr. Perwaiz Sheharyar a prominent contemporary poet of India. The poet under study has consciously touched those patterns of cultural and social life which belong to the common heritage of Muslims of subcontinent Indo-Pak. This study suggests that prose poetry is a non-controversial issue as far as Urdu language and literature is concerned."

پرویز شہر یار نے تحقیق، تنقید، افسانہ نگاری اور شاعری کے میدانوں میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ انہوں نے ترسیل و ابلاغ کے معاملات سے گہری دلچسپی لیتے ہوئے صاف، سادہ اور شستہ اردو میں اپنے دل کی باتیں کیں ہیں۔شاعری اور افسانہ نگاری میں ان کی پر کار سادہ بیانیوں کے اندر سے علامتوں کے اکھوے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔شہری زندگی کی عصری قباحتوں پر ان کی گہری نظر ہے۔انہوں نے اپنے تخلیقی ویژن کی روشنی میں بڑے شہروں پر اثر انداز ہونے والے معاشی، ثقافتی، سماجی اورنو آبادیاتی رویوں کو جابجا نشانہ تنقید بنایا ہے۔ان کے متون کو مابعد جدید متون کے دوائر میں رکھ کر پرکھنے سے ہمارے عصری مقامی اور عالمی ماحول کا کریہہ المنظر ننگا پن سامنے آتا ہے۔انسان نے انسان کو جس طرح نئی طرز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے اس کی کئی شکلیں پرویز شہر یار کے تخلیقی متون میں نظر آ سکتی ہیں۔

سرمایہ دار آقاؤں کو
مزدور اور کسان سے ڈر لگتا ہے،
اسی طرح ستّہ کا سکھ بھوگ رہی
سےاسی جماعتوں کو بھی
جمہوریت میں
بھوکے ننگے کروڑوں نوجوان سے ڈر لگتا ہے
حد تو ہے کہ
اب، وقت ایسا گراں آیا ہے
سنسان سے ا ور نہ بیابان سے ڈر لگتا ہے
بلکہ
دن دھاڑے
بھیڑ میں چلتے ہوئے انسان کو
انسان سے ڈر لگتا ہے (۱)

(کیوں ڈر لگتا ہے)

پرویز شہر یار10 جنوری1964 کو جمشید پور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اسی کی دہائی سے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔انہوں ہندوستان کے کئی اہم علم خیزاداروں(جمشید پور کو آپریٹو کالج (رانچی یونیورسٹی)، جواہر لال یونیورسٹی، نئی دہلی) ریاضی، انگریزی زبان و ادب اور اردو زبان و ادب

---

[1]ممتاز پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

کی تعلیم حاصل کی۔انہوں نے اردو فکشن کو بطور خاص تحقیق کا موضوع بنایا۔اس سلسلے میں ان کے ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کے لیے عمدہ تحقیقی مقالے لکھے۔ایم فل اردو کے لیے ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور'' (برائے جواہر لال یونیورسٹی، دہلی)تھا۔''راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی ادب کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر2009 میں انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔علاوہ ازیں انہوں نے خطاطی کا ڈپلوما(ترقی اردو بیورو، نئی دہلی) سے لیا۔ ماس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلوما (جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے حاصل کیا۔علاوہ ازیں دہلی یونیورسٹی ہی سے انہیں دو سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اِن بُک پبلشنگ (ایڈیٹنگ کی تخصیص) بھی ملااس سلسلے میں انکے تحقیقی مقالہ ''اردو لیزر ٹائپ سیٹنگ: اِٹس پرابلمز اینڈ چیلنجز اِن بُک پبلشنگ انڈسٹری اِن انڈیا'' کو بہت سراہا گیا۔

پرویز شہر یار کا اولین افسانوی مجموعہ ''بڑے شہر کا خواب''2004 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا۔ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ '' شجر ممنوعہ کی چاہ میں''2014 میں چھپا۔ ''منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور'' کے عنوان سے ان کا تحقیقی مقالہ 2009 میں طبع ہوا۔'' راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری'' کے نام سے ان کی کتاب2016 میں طبع ہوئی۔(۲)

پرویز شہر یار کی نظموں کا اولیں مجموعہ ''بڑا شہر اور تنہا آدمی''52 نظموں پر مشتمل ہے۔ان کی تحقیقی، افسانوی اور شعری تصنیفات کی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بڑی پذیرائی ہوئی۔

صباح الدین عبد الرحمن کہ جنہوں نے1985 میں ایوان غالب میں''غالب، ذوق اور ظفر '' سیمینار کے دوران منعقد ہونے والی ایک ادبی تقریب کی صدارت کی تھی اور مجھے اپنی طویل نظم ''فنون آشوب'' کا ایک اقتباس پڑھنے پر انہوں نے علمی سطح پر داد دی تھی اور کہا تھا کہ میری کتاب ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے'' میں موجود ثقافتی سپرٹ اسی صورت آگے بڑھ سکتی ہے کہ شاعر اپنی تہذیب اور ثقافت سے نابلد نہ رہے۔اردو زبان کی نمایاں لفظیات ہندوستان کے سنہری زمانوں کی تہذیب وتمدن کے آثار سمیٹے ہوئے ہے۔معاصر دہر پرستانہ دور میں اس تہذیب کی یاد اور اس پر عمل خاصہ مشکل نظر آتا ہے کہ جس میں مسجدوں کے صحنوں کی سی کشادہ ذہنی تھی،جسم و روح کی طہارت اور پاکیزگی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا، سچائی اور صداقت کو انسانیت کا معیار سمجھا جاتا تھا،لوگ صوفی سنتوں کے بتائے ہوئے انسانی رستوں پر چلا کرتے تھے۔صباح الدین عبد الرحمن نے جس دور کے تمدنی جلووں کی بات کی ہے اس میں بادشاہ صوفیوں اور قلندروں سے گہری نسبتیں رکھتے تھے۔ان کے نزدیک ''اللہ اکبر'' کے معنی کیا تھے اور وہ اس پر کتنا عمل کرتے تھے سرِ دست اس سے غرض نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور سامنے رکھنی چاہیے کہ اس دو لفظی مرکب کو جہاں کسی کی توصیف کے سلسلے میں بولا جاتا ہے وہاں اس کو مشعل راہ بنا کر دنیاوی فرعونوں، شدادوں اور نمرودوں کا سر بھی جھکایا جا سکتا تھا۔یہ الفاظ جابر سلطان کے سامنے اظہار حق کے ضمن میں بھی ممدو معاون تھے۔

دنیاوی طاقتیں سامراجی سربراہ، راجے، ملوک، بادشاہ، آمر،جاگیر دار اور سرمایہ دارسب کے سب جھوٹے خدا بن کر عامتہ الناس پر ظلم و جبر کے سلسلے روا رکھتے ہیں ان کے خلاف اعلائے کلمتہ الحق وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو ان فانی دہشت بازوں کو خدائی مخلوق قرار دے کر ان کے تکبر، غرور اور انانیت کوپر کاہ کی وقعت نہیں دیتے۔وہ یہ کام'' اللہ اکبر '' کے الفاظ پر یقین رکھتے ہوئے کر گزرتے ہیں۔ تجارتی اور صارفی سماج میں کلیدی حوالہ جلب زر ہے۔محبتوں اور عقیدتوں کو بھی منڈی نفسیات کی روشنی میں نئے انداز سے اپنایا جا رہا ہے۔روحانیت، ایمان اور مقدس رنگ و نشاں سب کے سب کاروباری سلسلوں میں ڈھل گئے ہیں۔

عقیدت کے نام پر ہو رہا ہے کاروبار
سبزو سیاہ، سرخ و زعفران
چاند، ستارے، اوم اور کرپان
خدائی رشتوں کے علائم

روحانی رشتوں کے نشان
بن گئے ہیں سب دُکان(۳)

(اللہ اکبر)

ان جنجالوں سے نجات پانے کے لیے اس رستے کا انتخاب لازمی ہے کہ جس پر چل کر انسان اپنی موت کو یاد کرتے ہوئے وحدتِ جمالِ خداوندی سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔اس کے نتیجے میں وہ کبر، طمع اور خوف کے رویوں کو ترک کر سکتا ہے۔پرویز شہر یار مولانا روم اور اقبال کے نقطہ نظر کی پیروی میں یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اگر اپنے سینے میں روح مطلق کی روشنی کا سراغ لگا لے تو وہ صاحبِ کشف وکمال ہو کر موت کو مات دے سکتا ہے اور''شہوت وخشم و طمع و غرور'' کے سرور و نشہ کو چھوڑ کر اپنے اندر کے انسان سے ہمکلام ہو سکتا ہے۔یہ ہمکلامی اسے صوفی، ولی، غوث اور قطب کے درجے کی جستجو کی طرف مائل کر سکتی ہے۔یہ اسے جیتے جی امر ہوجانے کی راہ پر لے آتی ہے۔''صوفی ہر دم مست قلندر'' تبھی ہوتا ہے جب وہ اللہ کو تہ دل سے اکبرمان کر ہر نوع کی فروشا فروشی سے کنارہ کشی کر لیتا ہے۔

رالف ایلی سن نے انویزیبل مین کے نام سے جو ناول لکھا ہے وہ اپنے سماجی اور ثقافتی حوالوں میں موجود خفیہ وارداتوں کا نقیب بھی ہے۔اس خیال کے ڈانڈے کہیں ٹی ایس ایلیٹ کی نظم میکاویٹی دی مسٹری کیٹ سے بھی ملتے نظر آتے ہیں۔یعنی یہ بلی ہر جگہ موجود ہوتی ہے اور جب کوئی اسے پکڑنے کا قصد کرتا ہے تو وہ وہاں موجود نہیں ہوتی۔تاریخ کے بائیں یا دائیں ہاتھ کے پر اسرار کرشمے اکیسویں صدی میں ویسے ہی موجود ہیں جیسے بیسویں صدی کی علمی دوغلاہٹ، فکری مغالطوں، سرمایہ دارانہ یدھوں، منڈی آفرینیوں، انسان کشیوں کے پس منظر میں موجود تھے۔کوئی بھی ایسی صورت حال کو دیکھ کر خدا کو پکارنے کی طرف ضرور متوجہ ہو گیا''مرے وجود کے بھیدوں کو جاننے والے۔۔مرے خدا مرے دل(مجید امجد)'' ابلیسی تماشے اگر جاری ہوں تو شاعر خدا سے کسی تدبیر کی بابت ضرور کچھ کہے گا۔

عہد حاضر میں سارتر کی وجودیت اور مارکس کی مارکسزم کے فکری افکار نے مادی اعتبار سے انسان کی انسانی بازیافت کے جن سلسلوں کی جانب اشارے کیے ہیں پرویز شہر یار کی نظم'' وجود کاچقماق'' میں ایک زاویے سے ان سے استفادے کا پیغام موجود ہے۔دشت جنوں، افکار کا ہجوم، زندگی کی سنگلاخی، الجھاتی دنیا، لامتناہی خیال نئے انسان کا گھیراؤ کر چکے ہیں۔ان کی وجہ سے اس کے اندرایسے الاؤ بھڑک اٹھے ہیں کہ جن سے نجات پانا اس کے لیے ضروری ہو چکا ہے۔خارجی ماحول بھی'' تنفس میں آگ بھر رہے ہیں''۔شاعر کا خیال ہے کہ باہر کی آگ سے انسان شاید خود کوبچا بھی لے مگر اس کے اندر کی آگ زیادہ خطرناک ہے۔یہ آگ احساس کی آگ ہے۔شاعر کا احساس جو ہمہ وقت اس کے سینے کو آتشکدہ بنائے رکھتا ہے۔وجود ی ضمیر اسے چین سے نہیں رہنے دیتا اور اسی طرح سے دنیا کے دکھ درد اس کے احساس پر کاری ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔اگر شاعر کے اندر اس کے احساس کی موت واقع ہو جائے تو ہی وہ اس الاؤ سے بچ سکتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ
سار اکا سارا جنگل
جل کے خاکستر ہو نہ جائے کہیں
باہر کی آگ سے تو بچا لوں گا خود کو مگر -------
خدشہ ہے
اپنے اندر کی آگ سے
نہ جل جاؤں کہیں
مانا کہ
دُشمنوں کی یلغار سے
ضربِ کاری کھاکر بھی سنبھل جاؤں گا
لیکن -------
خودی کے اُس مقام پر آج میں کھڑا ہوں! شہریار ؒ
زمانے کے تیر ِنظرسے گر بچ بھی گیا

اپنی شدتِ احساس سے
وجود کے چقماق سے
جل جاؤں گا !! (۳)

(وجود کا چقماق)

پرویز شہر یار نے اپنے سماج اور دنیا میں انسانوں کو کسمپرسی کی حالتوں میں بھی دیکھا ہے ''بھوک کی حمایت میں''،''بڑا شہر اور تنہا آدمی''،''یہ کون سا شہر ہے''،''فلسطینی بچے کا گیت''،''ایشیا جاگ ذرا''،''محنت کشوں کے نام''،''بزدل قوموں کے آقاؤں کے نام'' جیسی نظمیں تخلیق کر کے آج کے انسان کے بحران کو ایک باطنی طور پرحساس شاعر کی آنکھ سے دیکھا ہے۔وجود(مرد۔ عورت) سے متعلقہ معاملات یا باطن شناسی کی جہت پرویز شہر یار کی نظموں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔''گم ہو گئی ہے کوئی شئے''،''تخلیق کا وہ لمحہ''،''بس اِک آخری سوال ہے''،''فقط ایک نقطہ''،''محبت کے اس بیکراں سفر میں''،''بنتِ حوا سے خطاب''،''حاصلِ سےرِجہاں''،''وجود کاچقماق''،''خرد و جنوں کے درمیاں''،''تم نہیں سمجھو گی''،''جسم کے انڈیکس سے پرے''،''دو قدم''کے عنوانات سے لکھی جانے والی نظمیں جہاں ایک سطح پرشاعر کی مشاہداتی بصیرت،فکری معنویت اور احساساتی آنچ کی نقیب ہیں وہاں ان میں اپنے عہد کی خبرگیری کا پہلو بھی نمایاں طور پر سامنے آیا ہے۔

پرویز شہر یار کی نظمیں معاصر دانش اور انسانی روح فرسائی کی متنوع جہتوں کو محیط ہیں۔وہ شاعری کو قافیہ پیمائی یا ردیف بندی کا مظہر نہیں سمجھتے۔اس چیخ کا نام جانتے ہیں جو انسان کو کسی نہ کسی طور بباطن منتشر کرتی ہے۔ہم نے جس دور میں آنکھیں کھولی ہیں اس کا عمومی وتیرہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے چشم بندی کا متقاضی ہے۔یہ طور شاعروں اور دانشوروں کو بھی ذات کے ڈربوں میں قید کیے ہوئے ہے یعنی کبوتر کو آنکھیں بند کرنے کی تلقین کی جارہی ہے اور بلی کو جھپٹاؤ کا عندیہ دیا جا رہا ہے۔وہ شاعر جو ضمیر کی بار برداری کو ذات شناسی کا لازمہ سمجھ لیتے ہیں انہیں آنکھیں کھول کر موجود اور آتی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ان پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں ہوتا ہے یا نہیں وہ ان معرفتی حربوں سے سروکار نہیں رکھتے۔تاہم ان کی مزاحمتی سائیکی انہیں روشن خیال انسان دوستی کا رستہ دکھاتی ہے۔پرویز شہر یار کے خیال میں دنیا انقلابی آدرشوں سے مربوط ہوتی چلی جا رہی ہے۔ایسے میں شاعری کو بھی اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہے۔نئے دورِ انقلاب میں،''اگرطاؤسِ قلم کو ردےف اور قافےے کے گھنگروؤں سے نجات پا کر خیالات کی ترسیل کا کام کرنا ہے۔اپنی نظم ''نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے'' میں انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا ہے کہ شاعر کے باطن سے نظم ایسے نمودار ہوتی ہے جس طرح پتھروں کا سینہ چیر کرجھرنے پھوٹتے ہیں۔شاعری میں فکر اور جذبے کی آمیزش سے شاعر خود کو نئی دنیا سے ہمکنار کر سکتا ہے شاعر کے احساساتی بطون کے آتش کدے کے خیالات و جذبات اپنے اظہار کے لیے نئے رستے بنا لیتے ہیں۔شاعر کے اندر موجود لاوا شعور کی تمام بندشوں کو توڑ سکتا ہے۔یہ طشت از بام ہو کے کہرام مچا سکتا ہے۔ شاعر نظم کواظہار پانے سے روک نہیں سکتا۔ سماج کی پروردہ خیالات کی موجیں نظم کی صورت حصارذات سے باہر آ کر آبِ رواں اور موجِ بلاہو جاتی ہیں۔اسے چشمہ ٔ کوچک سے آبشاربن کر ابلاغ کے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔

نظم تو سماج کی پروردہ ہے شروع سے ہی
سماج میں وہ اپنا مرتبہ چاہتی ہے
تن کے آہنی قفس میں بھلا
کب تک رہ سکتی ہے مقید
نظم تو حصارِ ذات سے کچھ سوا چاہتی ہے
نظم ایک آبِ رواں ہے
نظم ایک موجِ بلا ہے
چشمہ ٔ کو چک سے آبشار ہُوا چاہتی ہے
نظم اپنے ہونے کا سبب ہونے کی وجہ چاہتی ہے
نظم آپ تک پہنچنے کا

حوصلہ چاہتی ہے!
نظم اپنی خوبصورتی کا
صلہ چاہتی ہے!! (۵)

(نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے)

شاعر کا آزاد شعور اس کی شاعری کو بحر بیکراں کی جانب لے جاتا ہے کہ بندگی میں بقول علامہ اقبال زندگی جوئے کم آب بن جاتی ہے۔شاعر کی نوائے پریشان سو الجھنوں کی جمع پونجی ہوتی ہے۔اگر ''شوریدہ سر'' شاعر قوم کے نوجوانوں یا دوسرے افراد کو جگانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیالی اور تصوراتی کوہ قافوں سے نکل کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔اس کے سامنے کسانوں، مزدوروں، عام آدمیوں کے مسائل و معاملات رہیں۔''تغزل کے پنکھ لگا کے ''اُڑنے والے شاعر بقول پرویز شہر یار سماجی ذمّے دارےوں سے نجات پالینا چاہتے ہیں اور انسانی رشتوں کے بندھنوں سے فرار اختیار کرنے کے در پے ہوتے ہیں۔

طاؤسِ قلم
رد بف اور کے گھنگرو پاؤں میں باندھ کے کاغذ کی بساط پر ناچنے سے قاصر
ہے،بحور و اوزان کے دائرہ دردائرہ حصار میں
اس کا دم گھٹتاہے
طاؤسِ قلم
مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے،دیوانہ وار
آج تو اِس پر شیوا کے تانڈو کا آھنگ ہے طاری(۶)

(جاگو کسان جاگو)

شاعر بحور و اوزان کے حصاروں میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔پرویز شہر یار نے نثری نظم میں موجود اس غیر عروضی آہنگ کی آنچیں محسوس کی ہیں جس میں ''طاؤسِ قلم مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے،دیوانہ وار؛ شیوا کے تانڈو کا آہنگ لیے۔ہندوستان کہ جو کسی زمانے میں ''سونے کی چڑیا'' اور ''کرشی پردھان ''علاقہ تھا عالمی سیاست کی گلوبل ویلجی ریشہ دوانیوں کے مکروہ سلسلوں کی وجہ سے کساد بازاری کا شکار ہو چکا ہے اور اس میں عام آدمی معاشی مجبوریوں سے تنگ آکر'' آتم ہتےہ '' کی راہ دیکھتے ہیں۔

انسان جب ہو
دانے دانے کو محتاج — ایک طرف
دوسری طرف
گوداموں میں سڑتے ہوں اناج
توکوئی کیسے غزل لکھے
حق گوئی پر
جب کاٹ لی جاتی ہو زبان
فریاد رس
ہاتھوں کو جہاں جھکادیا جاتا ہو
جب اپنے ہی ملک میں
ہم وطنوں سے ملتی ہوں پسپائیاں
جب انسان
نکسلائٹ اور خودکش بمبار
میں بدل جائے
ہائے!
صد افسوس اور ہائے
تو کوئی کیسے غزل لکھے(۷)

(تو کوئی کیسے غزل لکھے)

پرویز شہر یار کے شعری مجموعے کا جوہر اس بھوک کی عکاسی ہے کی جسے شکم اور روح کی بھوک کہا جاتا ہے۔بھوکے کسانوں اور مزدوروں کے لیے ماؤاسٹوں اور مارکسیوں کی

تحریکیں عوام کے حوصلوں کی نقیب ہیں۔ ماضی میں مولانا بھاشانی اور چارو موجمدار جیسے قائدین نے عوام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہا۔یہ سلسلہ بر صغیر میں مختلف شکلوں میں آج بھی جاری و ساری ہے۔عالمی گاؤں کی سیاستوں کے پرستارہوس پرست سربراہا نِ اقتدارعوام کی بھوک ننگ اور بے گھریوں میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔اب کسان اور مزدور کاخ امرا کے درو دیوار ہلانے کا عندیہ دے رہے ہیں۔''بھوک کی حمایت میں'' کا عنوان پرویز شہر یار کے شعور کی درست سمتی کا نشان دہ ہے۔

گندم سے آسودہ ہوتے ہی آدمی
ناف کی نشیبی وادیوں میں
اتر جاتا ہے
محو سفر ہو جاتا ہے
تاکہ
دُنیا کے سب سے اولیں انسانی جوڑے
آدم اور حوا سے
خود کو جوڑ سکے
سکوت موت کی علامت ہے اگر
تو اس علامت کو جامد ہونے سے بچائے
اس سکوت کو توڑ سکے
چشم حیواں میں غوطہ زن ہوجائے
بادبانِ کشتی نصب کرے
اپنی حمایت میں
ہوا کا رخ موڑ سکے(۸)

(بھوک کی حمایت میں)

علی سردار جعفری کی طرح انہیں بھی احساس ہے کہ ایشیا جاگ رہا ہے۔اس میں دورِ انقلاب کی آمد آمد ہے۔اس لیے ''سامنت وادوں اورجاگیرداروں'' کا دور زوال شروع ہونے کو ہے۔

ذرا سوچو!
سارا مغرب گلوبل وارمنگ کو رو رہا ہے
اِدھر پورا کا پورا ایشیاغفلت کی نیند سو رہا ہے
کبھی کبھی
میرے ذہن میں
یہ خیال آتا ہے کہ
ہمیں کچھ نہ کچھ اقدام کرنا ہوگا
ہمیں قبل از وقت انتظام کرنا ہوگا
ہاں ! ایشیا کو ہی
بڑھ کر یہ کام کرنا ہوگا
تمام ذمہ داریوں کو اپنے نام کرنا ہوگا(۹)

(ایشیا جاگ ذرا)

پرویز شہر یار کی نثری نظمیں اپنے اندر جس تازہ آہنگ کو لیے ہوئے ہیں اس پر عروضی اوزان کی تک بند شاعری قربان کی جا سکتی ہے۔ پنگلی اور میٹری نظموں کو درست اوزانی نظمیں ماننے والے عروضیے بوجوہ اپنے ساتھیوں کی فنی تضحیک کرنے سے باز نہیں رہتے۔پرویز شہر یار مجھ سے دلیر شاعر ہیں انہوں نے عروضی بکھیڑے کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا کہ

''میں نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل سے ہی یہ محسوس کیا کہ،آپ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب تب ہی کر پاتے ہیں جب آپ ان کی ذہنی سطح پر جاکر ان کی زبان میناوران ہی کے انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے قارئ ہدف کے پسندیدہ اور دلچسپ اسلوب میں ابلاغ کے مؤثروسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں۔چنانچہ، میں نے نثری نظم کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر اختیار کیا اورمیری اولیں نظمیں 1980ء میں کولکاتا سے ' اخبارِ مشرق' میں شائع

ہوئیں، جن کے عنوانات تھے، ’آدم اور حوا‘، ’ انتظار کے دوش پر‘ اور ’ سن باتھ ‘ وغیرہ ایسی نظمیں تھیں جو میرے نوجوان ادیب دوستوں میں بہت پسند کی گئیں۔ میرے لیے یہ بہت ہی امید افزا اور حوصلہ افزا مرحلہ ثابت ہوا،جس کی روشنی نے میرے آگے کے سفر کو آسان کر دیا۔‘‘(۱۰)

ہمارے اس ’’جان محمد خان‘‘(نظم ساقی فاروقی) کا سفر اس لیے آسان رہا کہ انہوں نے عروضیوں کی دہشت گردی کو ٹھوکروں پہ رکھا۔

شجر ممنوعہ کا پھل دانستہ چکھنا فطرت آدم کا قرینہ ہے۔ قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیوں ضروری ہے؟ سر سید احمد خان اور علامہ اقبال نے یہ کام کیوں کیا۔تو اس کے پس منظر میں مغلوبیت اور غلامی کا سوال ایک جزو لازم کے طور پر موجود ہے۔انگریزی حاکموں نے ’’تقسیم کرو اور حکومت کرو‘‘ کی پالیسی کے تحت ہندوستان سے پیار کرنے والے تمام ادوار سے تعلق رکھنے والے مقامی باشندوں کو ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے کہ جس کے نتائج نسل کشیوں کے متقاضی ہیں۔انگریزوں کی آمد سے قبل بدھوں کی نسل کشیاں بھی آریائی یدھ بازوں کی نفسیات کی مظہر تھیں۔

پھر مسلمانوں کے اقتدار کی طوالت کے لیے بھی کبھی باہمی تو کبھی دوسروں کی نسل ماری کے سلسلے جاری رہے۔تاہم انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے ہندوستان کے آزادی پسند باشندوں نے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں۔اندرونی غداروں کی بدولت وہ ہندو ستان پر قابض ہو کر ملکہ وکٹوریہ کا علم بلند کر گئے۔یہاں سے ہندوستانی انسان کا زوال شروع ہوا اور یہ زوال طویل سے طویل تر اس لیے ہوتا جا رہا ہے کہ مقامی باشندے مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے بھڑ رہے ہیں اور مرنے مارنے کی حکمت عملیاں اپنائے ہوئے ہیں۔دروا وڑ کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔آریائی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔سامی و عجمی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔عیسائی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔سکھ کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔کوئی یہ کہنے کو تیار نہیں ہے کہ جن مقامی باشندوں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے یک دیوتا ازم، ہندو ازم، جین ازم، بدھ ازم،اسلام، عیسائیت اور دیگر مذاہب قبول کیے ہیں ہندوستان پر ان سب کا حق ہے۔مذہب بدلنے سے مقامیت نہیں بدل سکتی۔اس لیے ہر مذہبی سیکٹر اپنی اپنی حفاظت کے لیے اپنے اپنے نوجوانوں کو تیار کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کی ایکتا پر کاری ضربیں لگاتا چلا جا رہا ہے۔یہ مقامی زوال کب تک چلے گا اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔علامہ اقبال نے اپنی مثنوی ’’پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ‘‘ میں ایک بند ’’اشکے چند بر افتراق ہندیاں‘ ‘ کے عنوان سے بھی لکھا ہے۔اس میں ہندوستان کے باشندوں کی ایکتا کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ رود گنگا اور دریائے اٹک سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کو باہمی اتحاد پیدا کر کے انگریزی سامراج کو دیس نکالا دینا چاہیے۔لیکن اس کے بر عکس ہندوستانی باشندوں نے آپس میں نسل کشیاں شروع کر دیں اور ہٹلر زدہ انگریز بغیر کوئی جان گنوائے ہندوستان چھوڑ گیا۔ہندوستان کے باشندوں کے باہمی مناقشے ایک نیشنالسٹ ہونے کے ناتے قائد اعظم جناح اور مہاتما گاندھی نے دور کرنے کی کوشش کی تاہم انگریزوں سے ملی ہوئی مقامی قیادتوں نے دونوں قائدین کے تصورات کو شدید زک پہنچائی۔ ہندوستان کی ایکتا ایک خواب کی صورت تو سامنے ہے لیکن نسل کشیوں کی منطق کے سبب یہ خواب ڈریکولائی بن چکا ہے۔

پرویز شہر یار ایسے میں اقبال کی طرح خاکم بدہن ’’خدا سے شکوہ‘‘ کر تے ہیں۔گردش ایام کا تجزیہ کرتے ہیں۔ناخدا کے نہ ہونے کی بات کی جانب اشارے کرتے ہیں۔ بزدل قوموں کے آقاؤں پر استعاراتی اظہار کرتے ہیں۔ انہیں سانپوں کی سرسراہٹیں اور سپیروں کی ریشہ دوانیاں نظر آتی ہیں۔صندل کی خوشبو اور سانپ کی بات سنانی پڑتی ہے۔راون کی تلمیح سے مقامی معنی خیزی کو متشکل کرنا پڑتا ہے۔

پرویز شہر یار کا مزاج تصوف کی فکریات سے گہرے طور پر مربوط ہے۔ان کے شعری مجموعے ’’بھوک کی حمایت میں‘‘ جا بجا ان رویوں کا اظہار ہوا ہے کہ جو دنیا کو ایک صوفی کی آنکھ سے دیکھے بغیر وجود میں نہیں آسکتے تھے۔خود شناسی، انسان بلندی، بھائی چارگی، محبت بندی، کشادہ مشربی، قدر تلاشی، توکل پسندی، خدا جوئی، مومن عقلی اور اسی نوع کے بہت سے دوسرے رویے اس مجموعے کی فکرسازی سے گہری نسبت رکھتے ہیں۔اس مجموعے کی ایک

نظم’’ ایک نظم امیر خسرو کے نام‘‘ میں اس عظیم صوفی شاعر کی نرالی اور اعلیٰ شخصیت کو کھلے دل سے خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے ’’بھکتی کی نئی راہ نکالی‘‘ اور سماع، محفل، دف، قوالی کے سلسلوں سے نسبت رکھی۔وہ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید خاص ہیں۔ان کی وساطت سے لوگ’’درِ شیخ المشائخ میں جھولی ‘‘پھیلاتے ہیں۔وہ شاعری اور موسیقی کے میدانوں میں بھی بلندمرتبے کے حامل ہیں :

راگ راگنی سب تیرے باندی
موسیقی، رقص سب تیرے غلام
کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں
تیرے آگے، سب مانگے پانی(۱۱)

(ایک نظم امیر خسرو کے نام)

حضرت نظام الدین اولیا(رح) سے ان کی محبت بے بدل تھی۔پرویز شہر یار نے اس طوطیِ ہند کو’’گنگا جمنی تہذیب کا امین ‘‘اور’’ہندو مسلم ایکتا کا نقیب‘‘ قرار دیتے ہوئے اردو زبان پر ان کے احسان کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔اسی طرح سے اس مجموعے کی ان عنوانات والی نظمیں’’ نئی دنیا کی خواہش‘‘،’’اچھا لگتا ہے‘‘،’’یہ سفر جاری رہے‘‘،’’تعاقب اپنے ہمزاد کا‘‘،’’تشکیک‘‘،’’مکان‘‘،’’مٹی کی عورت‘‘،’’قصّہ تیری چاہت کا‘‘،’’راجستھان کی ایک نظم‘‘،’’ایک نظم گلزار کے نام‘‘،’’عاقبت کا توشہ‘‘،’’ایک نظم امیر خسرو کے نام‘‘،’’ نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے‘‘،’’خدایا! ایسی کوئی تدبیر کر‘‘،’’گوا کے ساحل پر لیٹی ہوئی دوپہر‘‘،’’اللہ اکبر‘‘،’’ابلیس دور کھڑا تماشائی ہے‘‘ اپنی فکری اپج اور احساساتی نزاکت کے اعتبار سے عصری شعور سے مزین شاعر کے دل کی آوازوں سے معمور ہیں۔پرویز شہر یار کی نظموں میں موجود تلمیحات اور اسطوریں اس امر کی غماز ہیں کہ وہ ایسے علاقے کی سائیکی کا اظہار کر رہی ہیں کہ جس میں کعبہ و دیر کے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر فیض رسانیاں کر رہے ہیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں ترک اسلام کی ضرورت محسوس نہیں کی اور قشقہ کھینچنے اور دیر میں بیٹھنے کے میری حوالے کو شاعرانہ حوالہ سمجھ کر نظر انداز کیا ہے۔انہیں غالب کے اس شعر کی نزاکت کا علم ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے(۱۲)

اپنی تمام ترروشن خیالی کے باوجود کعبے کی پشت پناہی سے انہوں نے سر مو انحراف نہیں کیا۔نیا کلیسائی تاجرانہ ذہن بھی انہیں متاثر نہیں کر پایا۔انہوں نے نو آبادیاتی معاشی استحصال اور اس استحصال کے شیرازہ بند علم پر مومنانہ علم اور صوفیانہ بصیرت کو فائق رکھا ہے۔وہ اپنی تہذیب اور ثقافت سے مکمل طور پر جڑے رہے ہیں۔اردو زبان کی رائج لفظیات کے استعمال کو احسن جانتے ہوئے دہر پرستانہ دور میںاپنی ان روایات کو یاد رکھا ہے کہ جو کشادہ ذہنی کی علمبردار ہیں۔ان کی شاعری میں جسم و روح کی طہارت اور پاکیزگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔پرویز شہر یار نے اپنی انسان دوستی کا معیارسچائی اور صداقت کے اظہار کو بنایا ہے۔

حوالہ جات

١- پرویز شہر یار، بڑا شہر اور تنہا آدمی، 2012، دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،ص 32

2- پرویز شہر یار کی نظموں کا اولین مجموعہ ’’بڑا شہر اور تنہا آدمی‘‘52نظموں پر مشتمل ہے۔ان کی تحقیقی، افسانوی اور شعری تصنیفات کو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پرپذیرائی ملی۔

3- پرویز شہر یار، بھوک کی حمایت میں، دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2018، ص 140

4- ایضاً، ص127

5- ایضاً، ص130

6- ایضاً، ص154

7- پرویز شہر یار، بڑا شہر اور تنہا آدمی،2012، دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ص 70

8- بھوک کی حمایت میں، ص19

9- ایضاً، ص67

10- پرویز شہر یار، بھوک کی حمایت میں، دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2018، ص 11

11- ایضاً، ص 118

١٢- مرزا غالب، دیوان غالب،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،1967،ص264